ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ ۵/۲، جولائی۔ دسمبر ۱۹۹۰ء

ابتدائے تاریخ کا تصور اور قرآن

سلطان احمد اصلاحی

ادھر قریب کی صدیوں میں کتاب الٰہی اور خدائی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر انسان نے فکر و نظر کا جو نیا سانچہ تیار کیا ہے اور اپنے طور پر اس کے لیے جو بنیادیں وضع کی ہیں، ان میں سے ایک دورِ حاضر میں 'ابتدائے تاریخ' کا تصور بھی ہے۔ روئے زمین پر زندگی کے آغاز اور انسانیت کی ابتداء سے متعلق اس تصور کو اس اعتماد اور اس تکرار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ موجودہ علمی دنیا میں اسے ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ جس پر حاشیہ آرائی اور اس کی جزئیات کی مزید تحقیق و تفتیش تو کی جا سکتی ہے لیکن نفس اس تصور اور اس کی صحت و عدم صحت پر اب کسی گفتگو اور بحث و نظر کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ ابتدائے تاریخ کے اس نئے تصور کا خلاصہ ہے کہ کائنات کی اتفاقی تخلیق کے ساتھ روئے زمین پر زندگی اور اس کا نشو و ارتقاء بھی خوش گوار اتفاقات کا نتیجہ ہے۔ دنیا کا پہلا انسان جس نے روئے زمین پر قدم رکھا وہ گرد و پیش کے اپنے حالات کے محض رحم و کرم پر، آثار مدنیت سے عاری اور تہذیب و تمدن کی ابتدائی علامات سے بھی یکسر نا آشنا تھا۔ وہ غاروں، گپھاؤں اور جنگلوں میں رہتا، اسی کے پیڑ پتوں پر گذارہ کرتا اور اسی سے اپنے تن ڈھانکنے کا سامان کرتا تھا۔ ایک عرصۂ دراز تک انسان اسی حال میں رہا۔ یہاں تک کہ آگے مختلف تجربات کے نتیجے میں اس نے آگ جلانا اور پتھر کے اوزاروں سے شکار کرنا سیکھا۔ اس طرح گوشت کے استعمال سے آشنا ہو کر اس کی غذا میں کچھ ترقی ہوئی اور جنگل کے پتوں کی جگہ جانوروں کی کھالوں سے لباس کا مسئلہ بھی نسبتاً بہتر طور پر حل ہوا۔ پتھر کے اوزاروں کے استعمال کی اسی مناسبت سے اس دور کو 'پتھر کے زمانہ' (STONE AGE) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسانیت کے قافلہ کی یہ اس سے آگے کی منزل ہے جب اس نے لوہے کے اوزاروں کا استعمال سیکھ کر

کھیتی باڑی کا آغاز کیا۔ اس کی بدولت اس کے لیے اپنے دشمنوں سے بہتر دفاع کی بھی صورت پیدا ہوئی۔ انسانیت کے ارتقار کے اس زمانہ کو 'لوہے کا زمانہ' (IRON AGE) کا نام دیا جاتا ہے۔ جدید درسیات کے مطابق ابتدائی دور کا انسان جبکہ وہ لوہے سے آشنا ہوا اور اس کی مدد سے اس نے کھیتی باڑی کا آغاز کیا، اس کا زمانہ آج سے تقریباً دس ہزار سال پیشتر ہے۔[1] ابتدائے تاریخ کے اس تصور کی صداقت کا آج جو اعتراف ہے اور اسے جو قبول عام حاصل ہے، اس کے اندازہ کے لیے کافی ہے کہ موجودہ درسیات میں جغرافیہ اور ماحولیاتی مطالعات (ENVIRON-MENTAL STUDEIS) کے نصاب کا یہ ناگزیر حصہ ہے جس سے ابتدائی درجات ہی میں طالبعلم کو روشناس کرا دیا جاتا ہے۔ سیکولر پرائمری اسکولوں کی طرح اسلامی مدارس و مکاتیب کی جغرافیہ اور عام معلومات کی کتابوں میں یہ بھی مضمون اسی طرح شامل ہے اور مسلمان استاد بھی اپنے طالبعلموں کے سامنے ابتدائے تاریخ کی اس تعبیر کی تفہیم و تشریح میں کوئی جھجک اور رکاوٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں ابتدائے تاریخ کے اسی تصور کے سلسلے میں اسلام اور اس کے مأخذ اول، قرآن کا نقطۂ نظر معلوم کرنا ہے۔

روئے زمین پر انسان نے کب قدم رکھا اور زمین پر انسانی زندگی کا آغاز کب سے ہوتا ہے، ایک اندازے کے مطابق نوع انسانی کے اولین ریکارڈ کی ابتدا تین ہزار قبل مسیح سے ہوتی ہے۔[2] انسان کے "لوہے کا زمانہ" (IRON AGE) اور اس کی سہولیات سے آشنا ہونے کا دوسرا اندازہ، جیسا کہ ذکر کیا گیا آج سے دس ہزار سال پیشتر ہے۔ بائبل کی روایت کے مطابق دنیا کے پہلے انسان آدمؑ کی پیدائش کا زمانہ چار ہزار چار سال پیشتر مسیحؑ ہے۔[3] اسی روایت کے مطابق آدمؑ کے بعد دوسرے پیغمبر حضرت شیثؑ کا زمانہ تین ہزار آٹھ سو چوہتر (۳۸۷۴) قبل مسیحؑ اور حضرت نوحؑ کا زمانہ دو ہزار نو سو اڑتالیس (۲۹۴۸) پیشتر مسیحؑ ہے۔ ہندوں میں ابتدائے تاریخ کا سرا کہاں جا کر ٹوٹتا ہے، اسلام اور قرآن کو اس مسئلہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے قبل مسیحؑ کے زمانہ کو یوں بھی تاریکی کا دور (DARK AGES) کہا جاتا ہے جس کے بارے میں اندازے اور قیاسات اور اثریات کی مبہم اور گنجلک دریافتوں کے سوا انسان کے پاس کوئی تحقیقی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جبکہ صحیح تر لفظوں میں تحقیقی معلومات اور علمی روشنی کے آغاز کا

زمانہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شروع ہوتا ہے۔ فی الواقع تاریخ اُجالے میں آپؐ کے بعد ہی آئی ہے۔ بہر حال اس بحث سے قطع نظر کہ ہندسوں میں ابتدائے تاریخ کے تصور کا سرا کہاں ٹوٹتا ہے اور اس بحث میں پڑنے کا کوئی عملی فائدہ بھی نہیں ہے اور قرآن عام طور پر اس طرح کی معلومات اور بحثوں سے صرف نظر کرنے ہی کو ترجیح دیتا ہے، لیکن ابتدائے تاریخ کی زمانی تعیین کے ایک غیر متعلق مسئلہ سے قطع نظر کرکے، کتاب اللہ اس بحث کے دوسرے تمام پہلوؤں اور اس کے جملہ متعلقات پر بھرپور مواد اور سیر حاصل گفتگو کا سامان فراہم کرتی ہے۔ ذیل کی سطور میں ابتدائے تاریخ کی انہی متعلقہ دفعات کی تفصیل کتاب الٰہی اور اس سے ملحقہ مراجع کی روشنی میں پیش کی جاتی ہے۔

پہلا انسان اور اس کی خصوصیات:

ابتدائے تاریخ کے اس مروجہ تصور کا اولین جزو شروع کے انسان کا جاہل، وحشی اور آثار تمدن و تہذیب سے ناآشنائے محض ہونا ہے۔ اسلام کے صحیفہ قرآن کے لیے ابتدائی انسان کا یہ تصور ناقابل قبول ہے۔ روئے زمین پر پہلے انسان نے جتنے سو سال یا جتنے ہزار سال پہلے بھی قدم رکھا ہو، قرآن نے ایک سے زائد مقامات پر صراحت کی ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے قدم رکھنے والے انسان حضرت آدمؑ ہیں اور موجودہ نسل انسانی کا آغاز انہی آدمؑ اور ان کی بیوی حوا سے ہوتا ہے۔ قرآن میں سورۂ نساء جو معاشرتی حقوق کے بیان کی سورہ ہے، اس کا آغاز ہی اس آیت کریمہ سے ہوتا ہے:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي	لوگو ڈرو اپنے رب سے جس نے تم کو
خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ	ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے
خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا	اس کے جوڑے کو پیدا کیا اور ان دونوں
رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ (النساء: ۱)	سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیے

اس آیت کریمہ میں کسی ابہام کے بغیر صاف و صریح لفظوں میں یہ بات کہی گئی ہے کرۂ ارضی پر بڑی تعداد میں مردوں اور عورتوں کا جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آج موجود ہے، اس کا نقطۂ آغاز

حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی حضرت حواؑ ہیں۔ آیت کریمہ میں 'نفس واحدہ' سے مراد حضرت آدمؑ ہیں جیسا کہ اسلام کی بین الانسانی اخوت و مساوات کی نمائندہ مختلف و متعدد احادیث میں اسکی صراحت کی گئی ہے:

الناس بنو آدم وخلق اللہ آدم من التراب[۵]	تمام انسان آدمؑ کے بیٹے ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔
والناس بنو آدم وآدم من تراب[۶]	اور تمام انسان آدمؑ کے بیٹے ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔

قرآن حکیم میں یہی حقیقت دوسرے مقام پر بدیں الفاظ دہرائی گئی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا	لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو۔
(حجرات: ۱۳)	

صحیح مسلم کی ایک روایت میں بھی حضرت آدمؑ کے تمام انسانوں کے باپ 'ابوالبشر' ہونے کی صراحت ہے۔ جبکہ دوسرے موقع پر انھیں تمام انسانوں کا باپ 'ابوالناس' کہا گیا ہے[۸]۔

اب روئے زمین پر قدم رکھنے والے اس پہلے انسان کی خصوصیات پر نظر ڈالیے۔ قرآن کے مطابق دنیا میں آنے سے پہلے یہ پہلا انسان، آدمؑ اور ان کی بیوی خدا کے کامیاب بندوں کی ابدی قیام گاہ جنت میں خوب مزے سے رہتے تھے۔ بعد میں خدائی اسکیم کے مطابق ان کی ایک چوک کے نتیجے میں ان کو جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیا گیا۔ جنت میں حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی حضرت حواؑ کی لغزش کی تفصیل ہے کہ ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اس کے تمام درختوں اور پھلوں سے بے تکلف کھا سکتے ہیں۔ صرف ایک درخت کے پاس انھیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن انسان کا ازلی دشمن شیطان اس موقع پر انھیں بہکانے میں کامیاب ہو گیا اور ان کے کہے میں آکر آدم و حوا دونوں نے اس درخت سے کھا لیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنت کی دوسری نعمتوں اور سہولیات سے محروم کر دیئے گئے اور بعد میں انھیں وہاں سے نکل کر زمین پر جانے کا پروانہ ملا[۹]۔

دوسرے موقع پر اس کی تفصیل کے مطابق اس کا ایک اثر یہ ظاہر ہوا جو زیر نظر موضوع کی مناسبت سے اصل دلچسپی کا ہے کہ جنت میں ان دونوں کو فطری اور پیدائشی لباس کی جو سہولت میسر تھی، خدائی فرمان کی مذکورہ خلاف ورزی کے نتیجے میں آدم و حوا دونوں اس سہولت سے محروم ہو کر بے ستر و بے لباس ہو گئے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْ	توجب ان دونوں نے اس درخت کو چکھ لیا،
آتُهُمَا (اعراف: ۲۲)	ان کے اعضاء ستر ان کے سامنے کھل گئے۔

اصل دلچسپی کا ٹکڑا اس کے بعد کا ہے کہ اس طرح جب یہ دونوں لوگ بے لباس ہو گئے تو ان کا چین رخصت ہو گیا۔ دور جدید کے ابتدائے تاریخ کے تصور کے مطابق دور اول کے انسان کی طرح یہ لوگ سیکڑوں ہزاروں سال تک بے ستر و بے لباس ہونے پر قانع اور مطمئن نہیں رہے اور تجربے کی طویل ترین مدتیں گزارنے کے بعد انھیں اس کا شعور نہیں آیا، بلکہ قرآن کا بیان یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان جو ابتداء سے ساتر اور بالباس تھا، پہلی بار اپنی ایک غلطی کے نتیجے میں وہ بے لباس ہوا تو بے چین اور سراپا اضطراب میں تبدیل ہو گیا اور کسی توقف اور انتظار کے بغیر اپنی پیدائشی اور اندرونی طلب کے نتیجے میں اسے لباس کی جستجو ہوئی جس کی تلافی کے لیے اس نے جنت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانکنا شروع کر دیا۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْ	توجب ان دونوں نے اس درخت کو چکھ لیا،
آتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا	ان کے اعضاء ستر ان کے سامنے کھل گئے
مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۖ وَنَادَاهُمَا	اور وہ اپنے کو جنت کے پتوں سے ڈھکنے
رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَن تِلْكُمَا	لگے۔ اس پر ان کے رب کی طرف سے
الشَّجَرَةِ وَأَقُل لَّكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ	ان کے پاس آواز آئی۔ کیا میں نے تم دونوں
لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِينٌ	کو اس درخت سے منع نہ کیا تھا اور یہ نہ
(اعراف: ۲۲)	کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔

خدا تعالیٰ کی اس تنبیہ کے بعد آگے آدم و حوا کا جو رد عمل سامنے آتا ہے، موضوع کی مناسبت

سے وہ بھی توجہ کا طالب ہے۔ وہ ابتدائے تاریخ کے مروجہ تصور کے مطابق پہلے انسان کی طرح خیر و شر کے امتیاز سے بالکل عاری اور برائی بھلائی کی پہچان سے یکسر خالی نہ تھے، بلکہ ان کی اصل و سرشت میں خدا کی بندگی اور اس کی فرماں برداری کا احساس و ولیعت تھا جس سے مغلوب ہو کر انھوں نے اپنی مذکورہ چوک کے بعد عارضی بے لباسی کی تنبیہ سے بیدار ہو کر خدائے بزرگ و برتر کے حضور اپنی خطا کی معافی اور اس کی رحمت و بخشش کی طلب کے لیے اپنے کو مجبور پایا:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (اعراف : ۲۳)	وہ دونوں دست بہ دعا ہوئے۔ ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر تیرا کرم نہ ہوا تو ہم ضرور گھاٹے میں پڑنے والوں میں ہوں گے۔

سورۂ بقرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ و انابت کے یہ الفاظ انھیں بارگاہ ایزدی سے تلقین کیے گئے۔ اس طرح بعد کی زندگی میں حضرت آدمؑ کو حق تعالیٰ کی طرف سے جو تعلیمات و ہدایات ملنے والی تھیں، ایک طرح سے اس کا دروازہ اسی جنت میں کھل گیا۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (بقرہ : ۳۷)	تو آدمؑ کو اپنے رب کی طرف سے کچھ بول ملے جس کے بعد اس نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ ہاں وہی تو سب سے بڑھ کر توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ قرآن نے حضرت آدمؑ کے اس قصے کے پس منظر اور اس کے حوالہ ہی سے آگے اولاد آدم کو ستر پوشی کا حکم دیا ہے اور ایسے لباس کی تلقین کی ہے جو محض زینت و آرائش ہی کا وسیلہ نہ ہو بلکہ زندگی میں خدا کے خوف اور اس کے ڈر کا نمائندہ اور اس کا آئینہ دار ہو:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ	اے آدمؑ کی اولاد ہم نے تم پر لباس اتارا

لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ
وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ
الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ
الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا
لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ
يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ
حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا
الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

(اعراف : ۲۶، ۲۷)

جو تمہارے اعضاء ستر کو چھپانے کا ذریعہ ہے اور اس میں تمہاری زینت کا بھی سامان ہے اور اللہ کے ڈر کا لباس سب سے اچھا ہے یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے شاید کہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں۔ اے آدمؑ کی اولاد تم کو شیطان فتنہ میں مبتلا نہ کرے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا ان سے ان کے لباس کو اتروا تے ہوئے تاکہ انھیں ان کے اعضاء ستر کو دکھا دے۔ ہاں جس طرح وہ اور اسکے کارندے تم کو دیکھتے ہیں تم ان کو اس طرح نہیں دیکھتے ہو۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست بنا رکھا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

ان آیات کریمہ کا صاف اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے انسان آدمؑ زمین میں قدم رکھنے سے پہلے جنت میں بالباس تھے۔ زمین پر ان کی ذریت کے پھیلنے کے ساتھ ہی اسے اس کی تلقین کر دی گئی جس کا اسے پاس رہا۔ تمدن کے آغاز میں انسان سیکڑوں سال بے لباس اور تجربہ کے ہزاروں سال گذارنے کے بعد اسے اس کا احساس اور شعور نہیں آیا۔

خلافت آدمؑ:

پہلے انسان حضرت آدمؑ کے سلسلے میں قرآن نے اس سے آگے کی بات ان کی خلافت اور نیابت الٰہی کی کہی ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد حضرت آدمؑ کو پیدا کرکے اور بعد ازاں انھیں زمین پر بھیج کر اللہ تعالیٰ ان سے پیشتر کی دو مخلوقات، فرشتے اور جنات کے اس خلا کو پُر کرنا چاہتا

تھا جو ان کی موجودگی کے باوجود پر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی تفصیل قرآن نے اس امتحان کے ذیل میں کی ہے جو حضرت آدمؑ کو زمین پر بھیجے جانے سے قبل ان کی نسبت سے فرشتوں اور جنوں کے نمائندے ابلیس سے لیا گیا۔ فرشتے ایک پاک مخلوق ہیں جن کے اندر شر کا مادہ و دلیعت ہی نہیں ہے۔ وہ خدائی فرمان کے آگے ہمہ وقت سرفگندہ اور ہمہ آن اس کی تحمید و تقدیس میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ جنوں کا تھا جن کے مزاج میں شر اور جنگ و جدال غالب تھا، جس کی نمائندگی ان کے سردار ابلیس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے کے خدائی حکم کی سرتابی اور اس کے مقابلے میں بحثا بحثی اور کٹ حجتی کر کے دکھا دی۔ خدائی اسکیم میں یہ صورت حال ایک تیسری مخلوق کی مقتضی ہوئی جس کے اندر خیر اور شر دونوں کا مادہ اور اس کا میلان و دلیعت ہو۔ اور وہ اپنی آزادی اور اختیار کو کام میں لاتے ہوئے برائی کے مقابلے میں بھلائی اور زندگی میں خدا کی نافرمانی کے بجائے اس کی فرماں برداری کا راستہ اختیار کر کے اپنے آقا و مولا کو خوش کرنے کا سامان کر سکے۔ روئے زمین پر نوع انسانی کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کی موجود اپنی دو مخلوقات کے اسی خلا کو پر کرنا چاہا۔ خلافت اور نیابت الٰہی کے اس منصب کو پورا کرنے اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حضرت آدمؑ کے رجوع الی اللہ اور ان کی توبہ و انابت کی خصوصیت کے علاوہ سب سے غیر معمولی اور مہتم بالشان خصوصیت جس نے آدمؑ کو اس منصب کا اہل بنایا، قرآن کے بیان کے مطابق وہ فرشتوں کے مقابلے میں حضرت آدمؑ کی بڑھی ہوئی قوت علمی تھی جس کے ذخیرۂ وافر کی بارگاہ ایزدی سے ان کے حق میں ارزانی تھی، جبکہ فرشتے اس معاملے میں ان سے بہت پیچھے رہے اور نئی مخلوق کے سلسلے میں ان کے تمام تر اندازے اور قیاسات بے حقیقت ثابت ہوئے۔ اس کی پوری تفصیل کو قرآن کے الفاظ ہی میں سننا مناسب ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ	اور یاد کرو جب تیرے رب نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا	کہا کہ میں زمین میں (اپنا) ایک نائب
اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا	ٹھہرانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا کیا آپ
وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ	اس میں ان لوگوں کو بسائیں گے جو اس
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ	میں فساد پھیلائیں اور خوں ریزیاں کریں گے

إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَّمَ
آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ
عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ
هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ قَالُوا
سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝
قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۖ
فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۙ قَالَ
أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ
غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۙ وَ
أَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُونَ ۝

(البقرہ : ۳۰ - ۳۳)

جبکہ ہم آپ کی حمد و تسبیح کرتے اور آپ کی پاکی بیان کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔
فرمایا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ چنانچہ آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے پھر انھیں فرشتوں کے روبرو رکھا۔ اس پر ان سے کہا کہ مجھے ان کے نام بتلاؤ اگر تم سچے ہو۔ انھوں نے کہا تیری ذات پاک ہے۔ ہمیں کچھ علم نہیں سوائے اس کے جو تو نے ہمیں سکھا دیا بس تو ہی اصل علم والا، حکمت والا ہے۔ فرمایا۔ اے آدمؑ انھیں ان کے نام بتا دو تو جب اس نے انھیں ان کے نام بتا دیئے تو فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید کو جانتا ہوں اور وہ سب جانتا ہوں جو تم کھلے میں کرتے ہو اور وہ سب جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے جس 'خلیفہ' کی بات کہی ہے اس سے مراد حضرت آدمؑ ہیں اور اس خلافت کا مطلب ہے کہ وہ روئے زمین میں حق تعالیٰ کے احکام کا نفاذ عمل میں لائیں گے۔[۱۱] خلافت کے سلسلے میں یہ بحث تو ہے کہ اس کا تعلق تمام ذریت آدمؑ سے ہے یا یہ صرف حضرات انبیاءؑ اور ان کے پیرو کار صلحا و اتقیا سے خاص ہے۔ اختلاف صرف اس کی پہلی شق میں ہے، حضرات انبیاءؑ اور ان کے بچے پیرو کاروں کے سلسلے میں ان کے خلافت ارضی کے منصب پر فائز ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔[۱۲] اس طرح ابوالبشر سیدنا آدمؑ کی

خلافت کا مسئلہ متفقہ ہے۔ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ اس سلسلۂ آیات میں فرشتوں نے اس نئی مخلوق کے سلسلے میں اپنا جو اشکال پیش کیا ہے اس کا منشا یا تو ان کا استنباط و قیاس ہے کہ ہم جیسی پاکباز مخلوق کی موجودگی میں جب ایک نئی مخلوق کے پیدا کیے جانے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے تو لازماً وہ طبعی نیکی اور معصومیت کے اوصاف سے ہٹ کر فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی وغیرہ جیسی برعکس خصوصیات ہی کی حامل ہوگی۔ اس کی دوسری توجیہ اس روایت کی روشنی میں ہے جس کے مطابق انسانوں سے پہلے اس زمین پر جنوں کی آبادی تھی اور بحکم خدا فرشتوں کی طرف سے انھیں سمندروں اور پہاڑوں کی طرف ڈھکیل دیئے جانے کی صورت میں انھیں ان کی اس خصوصیت فتنہ و فساد اور قتل و خوں ریزی کا پیشگی تجربہ تھا۔[۱۳] آگے فرشتوں پر اس نئی مخلوق کی برتری اور منصب خلافت کے لیے اس کے بہتر استحقاق اور اہلیت کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ جو اس سلسلۂ گفتگو میں خاص اہمیت اور دلچسپی کی چیز ہے۔ فرشتوں کے بالمقابل اس نئی مخلوق انسان کے پہلے نمائندے حضرت آدمؑ کی برتری کا سبب ان کا 'علم اسماء' ہے جس سے بمشیت ایزدی انھیں مخصوص طور پر نواز دیا گیا تھا۔ 'اسماء' کی سب سے مشہور اور معروف توجیہ 'مسمیات' چیزوں اور وجودوں کی ہے جسمیں غیر ذی عقل اشیاء اور وجودوں کے ساتھ خاص طور پر ذی عقل وجودوں کا پہلو ابھرا ہوا ہے۔[۱۴] اس موقع پر فرشتوں کی عجز و درماندگی کے روبرو حضرت آدمؑ نے خدا تعالیٰ کے عطا کردہ اس علم کے زور سے ان تمام وجودوں کی تفصیل اور ان کی تخلیق کی حکمت اور اس کی غرض و غایت ایک ایک کر کے بتا دیں۔[۱۵] اس موقع پر ذی عقل وجودوں 'ھم' 'ھُم' اور 'ھولاء' کے ابھار نے سے اشارہ نکلتا ہے کہ کائنات کی دیگر اشیاء کے خواص اور ان کی تفصیلات کے ساتھ خاص طور پر اس وقت ذریت آدمؑ کے جلیل القدر پیغمبروں اور بڑے بڑے صلحاء اور اتقیاء کو لا کھڑا کیا گیا۔ بحکم خدا عالم مثال میں حضرت آدمؑ نے ان کا زور دار تعارف کرایا تو فرشتوں کو اپنے پیشگی اندازے کی غلطی کا احساس ہوا اور وہ سرتاپا ندامت اور بارگاہ ایزدی سے عفو و درگذر کے طالب بن گئے۔

خلافت آدمؑ کے اس پورے واقعہ کی تفصیل بتاتی ہے کہ روئے زمین پر قدم رکھنے سے پہلے ہی دنیا کا پہلا انسان علم کی دولت سے آراستہ ہو کر خلافت الٰہی کے عظیم منصب پر فائز

ہو چکا تھا۔ علم الٰہیات اور علم طبیعیات دونوں میں مہارت اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ بحکم خداخواص اشیاء کی تفصیل اور اپنی ذریت صلحاء و اتقیاء کو سامنے لا کھڑا کر کے ان دونوں ہی میدانوں میں اپنی برتری کا ثبوت فراہم کر کے فرشتوں کو مات کرنے کے ساتھ اس نے اس دنیا میں قدم رکھا۔

نبوت آدمؑ:

اس سے آگے کا مرحلہ حضرت آدمؑ کی نبوت کا ہے۔ اس تفصیل سے حضرت آدمؑ کا دنیا کا پہلا انسان اور ان کا خلافت الٰہی کے منصب پر فائز ہونا واضح ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نبوت کا مسئلہ بھی متفقہ ہے۔ قرآن کے واضح اشارات اس کے حق میں ہیں اور عقائد میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔ امت کے سواد اعظم کے نمائندے اشاعرہ کی معروف و متداول کتاب شرح عقائد نسفی میں ہے:

واول الانبیاء آدم[۱۶] — سب سے پہلے نبی حضرت آدمؑ ہیں۔

آگے اس کے دلائل بیان کیے گئے ہیں جس میں کچھ لوگوں کی طرف سے ان کی نبوت کے انکار کو موجب کفر گردانا گیا ہے:

اما نبوۃ آدم فبالکتاب الدال علی انہ قد امر ونہی مع القطع بانہ لم یکن فی زمن نبی آخر فھو بالوحی لا غیر وکذا السنۃ والاجماع فانکار نبوۃ علی ما نقل عن البعض یکون کفرا[۱۷]	جہاں تک حضرت آدمؑ کی نبوت کا سوال ہے تو وہ قرآن سے ثابت ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے حکم دیا اور منع کیا جبکہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ آپ کے زمانہ میں کوئی دوسرا نبی نہیں تھا۔ اسی طرح سنت اور اجماع امت سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے تو ان کی نبوت کا انکار جیسا کہ بعض لوگوں سے اسے بیان کیا گیا ہے، کفر ہوگا۔

چوتھی صدی ہجری کے عالم فقیہ ابو اللیث سمرقندی م ۳۹۳ھ نے بھی اپنی کتاب بستان الفقیہ

میں پہلے پیغمبر سے لے کر آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرات انبیاء کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں پہلا نبی حضرت آدمؑ کو قرار دیا گیا ہے:

اول الانبیاء آدمؑ ثم شیثؑ ابن آدمؑ ثم ادریسؑ ثم نوحؑ الخ [18]	تمام نبیوں میں سب سے پہلے آدمؑ ہیں۔ پھر آدمؑ کے بیٹے حضرت شیثؑ پھر حضرت ادریسؑ پھر حضرت نوح علیہ السلام الخ

حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدمؑ کے نبی اور رسول ہونے کی صراحت کی ہے۔ حضرت ابوذر صحابیؓ کی روایت ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

عن ابی ذر قال قلت یارسول اللہ ارأیت آدم أنبیا کان؟	حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! آپ کیا فرماتے ہیں کیا حضرت آدمؑ نبی تھے؟

جواب میں ارشاد ہوا:

نعم نبیا رسولا یکلمہ اللہ قبیلا [19]	فرمایا: ہاں وہ نبی اور رسول تھے جن سے اللہ سبحانہٗ روبرو کلام کرتے تھے۔

یہ روایت جس کی سند اگرچہ ضعیف ہے اس میں بھی حضرت آدمؑ کے پہلا رسول ہونے کی صراحت ہے:

اول الرسل آدم واٰخرھم محمد [20]	تمام رسولوں میں سب سے پہلے آدمؑ ہیں اور ان سب کے آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

جہاں تک قرآن کا سوال ہے۔ اس کے ایک سے زائد اشارات حضرت آدمؑ کی نبوت کے حق میں ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں حضرت آدمؑ کی طرف سے شجر ممنوعہ کو کھانے کی غلطی اور چوک کے تذکرہ کے فوراً بعد کتاب اللہ کا کہنا ہے:

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ	پھر ان کے رب نے ان کو منتخب کیا۔

وَهَدٰى ○ اس نے ان کی توبہ قبول کی اور ان کو راہ یاب کیا۔ (طٰہٰ : ۱۲۲)

آیت کریمہ میں موجودہ عیسائیت کے حضرت آدمؑ کی پیدائشی گنہگاری کے عقیدہ کے برعکس صاف و صریح لفظوں میں حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی خطا کی معافی اور ان کی توبہ قبول کیے جانے کا تذکرہ ہے۔ جیسا کہ قرآن میں دوسرے موقع پر بھی حضرت آدمؑ کی توبہ قبول کیے جانے کی صراحت ہے۔[۲۱] اس کے ساتھ ہی آیت بالا میں 'اجتباء' اور 'ہدایت' کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان سے سیدنا آدمؑ کی نبوت و رسالت کا صاف اشارہ نکلتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن حکیم میں 'اجتباء' کا لفظ عام اہل ایمان بندوں کے انتخاب اور ان کی نسبت سے حق تعالیٰ کی خوشنودی اور پسندیدگی کے اظہار کے لیے بھی آیا ہے[۲۲]۔ لیکن اس کا غالب استعمال نبوت اور رسالت ہی کے لیے ہے۔ اس کی سب سے صریح مثال سورۂ مریم آیت ۵۸ میں ہے جس میں آیت بالا ہی کی طرح 'اجتباء' اور 'ہدایت' کا استعمال انبیائی جماعت کے لیے ایک ساتھ ہوا ہے۔ ابتدائے سورہ سے حضرت زکریاؑ اور ان کے بیٹے حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت اسماعیلؑ اور آخر میں حضرت ادریسؑ کے ذکر کے بعد فرمایا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ○ (مریم : ۵۸)	نبیوں کی یہی جماعت ہے جن پر ہمارا خاص انعام ہوا، آدمؑ کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے جن میں ہم نے نوحؑ کے ساتھ سوار کیا اور ابراہیمؑ کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے جنہیں ہم نے راہ یاب کیا اور چیدہ قرار دیا۔ ان کا حال ہے کہ جب ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو سجدے میں گر جاتے ہیں اور زار و قطار روتے ہیں۔

مذکورہ فہرست میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ دونوں الفاظ ایک ساتھ دوسرے موقع پر بھی خاص انبیائی جماعت کے لیے استعمال ہوئے ہیں:

....وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ	.....اور اسماعیلؑ اور یسعؑ اور یونسؑ اور
وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۙ	لوطؑ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں
وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ	پر فضیلت بخشی۔ اور ان کے آباء و اجداد سے
وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى	اور ان کی نسلوں سے اور انکے بھائیوں میں سے
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝	بھی بہت سوں کو ہم نے اسی مقام سے سرفراز کیا اور
(انعام : ۸۶-۸۷)	ہم نے انھیں چیدہ قرار دیا اور انکی سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی۔

'اجتباء' اور 'ہدایت' کے یہ دونوں الفاظ یکجا سیدنا ابراہیمؑ کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا	ابراہیمؑ اپنے آپ میں ایک جماعت تھا اللہ
لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ	کے لیے جھکنے والا، یکسو اور وہ مشرکوں میں
شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهِ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ	سے نہ تھا۔ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر بجا
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝	لانے والا تھا۔ اللہ نے اسے چیدہ قرار
(نحل: ۱۲۰-۱۲۱)	دیا اور اس کی سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی۔

'اجتباء' کا لفظ دوسرے موقع پر انفرادی حیثیت میں حضرت یونسؑ[۲۳] اور حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے آیا ہے[۲۴]۔ جبکہ سورۂ آل عمران میں اس لفظ کو پوری انبیائی جماعت کے لیے عام کر دیا گیا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ	اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تم میں سے ہر ایک
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ	کو (براہ راست) غیب سے مطلع کرے
مَنْ يَّشَاۗءُ ۠	بلکہ اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا
(آل عمران : ۱۷۹)	ہے (اس کام کے لیے) منتخب کرتا ہے۔

'اجتباء' ہی کا ہم معنی لفظ 'اصطفاء' ہے۔ اس کا غالب استعمال بھی قرآن میں انبیائی جماعت ہی کے لیے ہے:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰي	کہو سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور
عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ۭ...	سلامتی ہو اس کے (خاص) بندوں پر

(نمل: ۵۹) جنہیں اس نے منتخب قرار دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے سلسلے میں ارشاد ہوا:

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

اور ہم نے اسے دنیا میں منتخب قرار دیا اور وہ ضرور آخرت میں نیکوکاروں میں ہوگا۔

(بقرہ: ۱۳۰)

اور حضرت موسیٰؑ کے سلسلے میں فرمایا:

يٰمُوْسٰٓى اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ

۲۵

اے موسیٰؑ میں نے تم کو تمام لوگوں پر منتخب قرار دیا۔ تم کو اپنے پیغامات سے نوازا اور ہم کلامی کا شرف عطا کیا۔

(اعراف: ۱۴۴)

سورۂ آل عمران میں دوسرے جلیل القدر پیغمبروں کے ساتھ ایک ہی فہرست میں اس لفظ کا استعمال سیدنا آدمؑ کے لیے بھی ہوا ہے۔ جو ان کے منصب رسالت و نبوت پر فائز ہونے کا کھلا اشارہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ کے خاندان کو اور عمرانؑ کے خاندان کو دنیا والوں پر منتخب قرار دیا۔ یہ پوری نسل ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہے اور اللہ بڑا سننے والا، جاننے والا ہے۔

(آل عمران: ۳۳، ۳۴)

سورۂ بقرہ میں قصہ آدمؑ کے ساتھ ہی زمین پر اترنے کے حکم کے پہلو بہ پہلو آدمؑ اور ان کی ذریت کو ہدایت الٰہی کی پیروی اور اس کی خلاف ورزی کے انجام سے خبردار کر دیا گیا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

ہم نے کہا تم سب جنت سے اتر جاؤ تو تمہارے پاس میری طرف سے جو کوئی ہدایت آئے گی تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو ان لوگوں پر کوئی ڈر نہ ہوگا اور

بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ؏۲۶ (البقرہ : ۳۸، ۳۹)	نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے تو یہ دوزخی لوگ ہوں گے جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیات کا صریحی تقاضا ہے کہ حضرت آدمؑ جنت سے نکل کر اس زمین پر خالی ہاتھ نہیں آئے۔ انھوں نے روئے زمین پر الٰہی ہدایت کے ساتھ قدم رکھا اور اپنی ذریت کی نسبت سے انھیں 'ابوت' ہی نہیں بلکہ 'نبوت' کا مرتبہ ومقام بھی حاصل تھا۔ اس صورت میں تفسیروں میں بعض مواقع پر حضرت نوح علیہ السلام کے پہلے رسول ہونے کی جو بات کہی گئی ہے[۲۷] اس کی توجیہہ زمانی فرق اور احوال وظروف کی رعایت سے حضرت نوحؑ کی رسالت کی وسعت وعمومیت اور اس مقصد سے ان کی بڑھی ہوئی جاں فروشی اور جاں سپاری ہے جس کی تفصیل خاص طور پر قرآن کی سورۂ ہود میں ہے۔ جبکہ سورۂ نوح پوری کی پوری ان کے کار رسالت کی تفصیل کے لیے وقف ہے۔

پہلے انسان سیدنا آدمؑ کے سلسلے کی یہ تفصیلات ابتدائے تاریخ کے آج کے مروج تصور کو پاش پاش کرتی ہیں کہ آغاز تمدن میں انسان عرصۂ دراز تک جہالت کے اندھیروں میں پڑا رہا۔ ہزاروں سال بعد اسے علم وعقل کی کچھ روشنی دیکھنی نصیب ہوئی۔

نبوت آدمؑ کے دیگر تقاضے :

سیدنا آدم علیہ السلام کی نبوت اور رسالت ثابت ہو جانے کے بعد قرآن کے اشارات اور اس کی تصریحات سے اس کے دوسرے تقاضے بھی سامنے آتے ہیں۔ سورۂ مومنون میں رسولوں کی پوری جماعت کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے :

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ○ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ○ ؏۲۸ (مومنون : ۵۱-۵۲)	اے رسولو، ستھری چیزیں کھاؤ اور نیکی کے کام کرو۔ تم جو کچھ کرو مجھ کو اس کا پتہ ہے اور یہ تمہاری جماعت ہے ایک ہی جماعت اور میں تمہارا رب ہوں۔ تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔

ان دونوں آیتوں میں تمام رسولوں کی مشترک شریعت کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ سے ڈر کر رہنا اور پوری زندگی میں اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق چلنا جس کا نام 'عمل صالح' ہے۔ انبیائی شریعت کی ایک ایسی ہی مشترک دفعہ حلال چیزوں کو حلال طریقہ سے کھانا ہے۔ جس کی اس سلسلہ آیات میں 'کُلُوا مِنَ الطَّیِّبٰت'، حلال چیزیں حلال طریقے سے کھاؤ، سب سے پہلے تلقین کی گئی ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اس موقع پر آیت کے اس ٹکڑے کی یہی تشریح کی ہے[۲۹]۔ 'طیبات' کا ترجمہ شاہ صاحب ہر جگہ 'ستھری چیزیں' کرتے ہیں۔ اس موقع پر بھی انھوں نے اس کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ دوسرے موقع پر وہ 'ستھری چیزوں' کی جو تشریح کرتے ہیں کہ جانوروں کے بالمقابل بنی نوع انسانی کے دو امتیازات میں ایک خشکی اور تری میں سواری کی نعمت کے علاوہ دوسری چیز اس کا ستھری چیزیں استعمال کرنا ہے۔ جانوروں کے برعکس انسان پھلوں کے چھلکے اتار کر اور غلّہ کی بھوسی پیس کر اسے پکا کر کھاتا ہے[۳۰]۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس مقام پر آیت زیر بحث میں 'طیبات' کے اس پہلو کو شامل نہ مانا جائے۔ سورۂ اعراف کی آیت کریمہ بالکل اسی سیاق اور اسی پس منظر میں ہے۔ اسی سے مومنون کی آیت بالا میں 'طیبات' کی مذکورہ تشریح کی تائید ہوتی ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ (اعراف: ۳۲)	کہو اللہ کی زیب و زینت کی چیزوں کو کس نے حرام قرار دیا جنھیں کہ اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالا اسی طرح روزی کی ستھری چیزوں کو۔ کہو دنیا کی زندگی میں تو یہ ان لوگوں کے لیے ہے ہی جو ایمان والے ہیں جبکہ قیامت کے دن یہ خالص انہی کا حصہ ہوگی۔

'روزی کی ستھری چیزیں'، جو مشیت خداوندی سے دنیا میں کافر و مومن ہر ایک کو دستیاب ہیں لیکن قیامت کے روز جو خالصۃً اہل ایمان کا حصہ ہوں گی تو دوسری زندگی میں حلال چیز کو حلال طریقے سے کھانے کا موقع نہ ہو کر اس کی پاک اور ستھری چیزوں کی یہ تشریح ہی قابل ترجیح

ٹھہرتی ہے کہ دنیا کی پاک اور بہترین چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ سے یہاں اپنے بندوں کے لیے فراہم کر رکھی ہیں، ابتدائے انسانیت سے پیغمبروں کے واسطہ سے انسانوں کو ان سے استفادہ اور ان سے فیض یاب ہونے کا حکم رہا ہے۔ پھر جب تمام رسولوں کو اس کا حکم رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت آدمؑ کا اس سے استثنا رہو۔ روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ جنت سے زمین پر قدم رکھنے کے بعد حضرت آدم کو لوہے کی صنعت سکھائی اور انھیں کھیتی باڑی کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ انھوں نے کھیتی کی اور اس کے تمام مراحل طے کیے۔ فصل تیار ہونے کے بعد اسے کاٹا، اس کی مرائی کی۔ دانے کو صاف کیا پھر اسے پیسا، پھر اس کی روٹی تیار کی اور پھر اسے کھایا۔[۳۱] یہ الگ بات ہے کہ جنت میں انھیں کھانے پینے کا جو آرام حاصل تھا اپنی تمام کوشش کے باوجود دنیا میں وہ اس مرتبہ کو نہ پہنچ سکے۔[۳۲]

نبوت آدمؑ کے ان تقاضوں کی تفصیل سے طریقۂ عبودیت سے ان کی آشنائی کے ساتھ تمدن کے طور طریقوں سے ان کی اولین آگاہی کا پتہ چلتا ہے جس سے ابتدائے تاریخ کے مروجہ مذکورہ تصور کی صاف لفظوں میں تردید ہوتی ہے کہ آغاز انسانیت میں انسان آثارِ تمدن سے بالکل ناآشنا اور محض انسان کی شکل میں انسانیت سے خالی تمام تر حیوانی خصوصیات کا حامل تھا۔

ہابیل و قابیل کا قصہ :

ابتدائے تاریخ کے مطلوبہ قرآنی تصور کی تائید حضرت آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے قصے سے بھی ہوتی ہے۔ تفصیلات اور نتائج کے فرق کے ساتھ کتاب مقدس عہد نامۂ قدیم کتاب پیدائش میں بھی ہابیل اور قائن کے نام سے یہ قصہ مذکور[۳۳] ہے۔ قرآن میں سورۂ مائدہ میں ان کے قصہ کی تفصیل میں کہا گیا ہے :

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ	اور ان لوگوں کو آدم کے دونوں بیٹوں کا
إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا	سچا واقعہ سناؤ جبکہ ان دونوں نے
وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَ	ایک قربانی پیش کی تو ان میں سے

قْتُلَنَّكَ ۗ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ
الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ
لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ
لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ
بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ
اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝
فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ
فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

(مائدہ : ٢٧ - ٣٠)

ایک کی طرف سے وہ قبول کر لی گئی اور
دوسرے کی طرف سے قبول نہیں کی گئی
اس (دوسرے) نے (پہلے سے) کہا میں
تجھے ضرور قتل کردوں گا۔ اس نے کہا اللہ
تو بس ڈرنے والوں ہی سے قبول کرتا
ہے۔ اگر تو مجھ تک اپنے ہاتھ کو بڑھاتا
ہے تاکہ مجھے قتل کردے تو میں اپنے
ہاتھ کو تجھ تک بڑھانے والا نہیں کہ
تجھے قتل کردوں۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں
جو سارے جہاں کا مالک ہے۔ میں چاہتا
ہوں کہ تو میرے گناہ اور اپنے گناہ کا
بوجھ ساتھ اٹھائے اور اس طرح دوزخیوں
میں سے ہوجائے اور ظالموں کا یہی
بدلہ ہے۔ تو اسے اسی کے جی نے اپنے بھائی
کے قتل کے لیے تیار کرلیا تو اس نے اسے
قتل کردیا اور اس طرح وہ گھاٹے والوں
میں سے ہوگیا۔

جمہور مفسرین کے مطابق یہ واقعہ حضرت آدم کے دو سگے بیٹوں کا ہے۔[٣٤] قرآن میں اس کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے اس کا یہ صریحی تقاضا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں اس واقعہ کے حوالہ سے قیامت تک ہونے والے قتل کے ہر وبال میں اس طریقہ بد کے بانی ہونے کی حیثیت سے آدمؑ کے پہلے بیٹے کو شریک ٹھہرایا گیا ہے۔[٣٥] ابنیت آدم کو حقیقت سے مجاز میں پھیر کر اس واقعہ کے بنی اسرائیل کے دو افراد سے متعلق ہونے کی جو روایت ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اس کی غرابت بہت بڑھی ہوئی اور اس کی اسناد بھی محل نظر ہے۔ تفسیروں کے مطابق یہ واقعہ

اس وقت پیش آیا جب حضرت آدم حیات تھے اور حج کو گئے ہوئے تھے۔[۳۶] ہابیل نے مینڈھے کی قربانی پیش کی اور قابیل نے کھیتی کا نذرانہ گذارا۔ ہابیل چونکہ قرآن کی صراحت کے مطابق خوفِ خدا کی دولت سے مالا مال تھا اس لیے اللہ کی طرف سے اس کی قربانی قبول کر لی گئی۔ جس کی علامت یہ ہوئی کہ پچھلی شریعتوں کے دستور کے مطابق آسمان سے ایک آگ اتری اور اس قربانی کو صاف کر گئی۔[۳۷] جبکہ قابیل کا نذرانہ جوں کا توں باقی رہا جو اس کے عدم مقبول ہونے کی علامت تھی۔ اس پر وہ حسد سے باولا ہوا[۳۸] اور آخر کار اپنے بھائی کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے ہی اسے چین آیا۔

واقعہ کی یہاں تک کی کڑی سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں جن سے ابتدائے تاریخ کے مروجہ تصور کی تردید ہوتی ہے۔ کنز العمال کی ایک روایت کے مطابق حضرت آدمؑ نے کل ایک ہزار برس کی عمر پائی[۳۹] اور جیسا کہ اوپر گذرا یہ واقعہ ان کی حیات میں ہوا۔ اس کا مطلب ہوا کہ روئے زمین پر انسان کے آباد ہونے کے ایک ہزار سال کے اندر اندر ہی آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا یہ واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی قرآن کی مذکورہ تفصیل میں سب سے پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ آغاز انسانیت ہی سے خدائی شریعت میں اتنی ترقی تھی کہ اس کے اندر خدا کے حضور قربانی کا تصور موجود تھا اور زندگی میں تقویٰ اور خوفِ خدا انسانیت کی سب سے اعلیٰ ترین قدر تھی جس سے آدمؑ کے بیٹے ہابیل آراستہ تھے۔ ساتھ ہی اس زمانہ ہی کے انسان میں گناہ 'اثم' اور ثواب کا تصور موجود تھا۔ اور اس جرم اور گناہ کے نتیجے میں ابتدائی دور کا انسان بھی جنت و جہنم کی حقیقت سے آشنا تھا۔ چنانچہ قابیل نے جب اپنے بھائی کو قتل کی دھمکی دی تو سب سے پہلے تو ہابیل نے اس سے 'خدا تعالیٰ تو صرف تقویٰ والوں ہی کی قربانی قبول کرتا ہے' اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ فرما کر اسے اس وصف سے آراستہ ہونے کی تلقین کی۔ بعد ازاں اپنے خوفِ خدا (اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ' (میں اس خدا سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا مالک ہے) کے حوالہ سے اس کے بدلے میں جوابی کارروائی سے معذرت ظاہر کی۔ آخر میں اپنے بھائی کو اقدام قتل اور دوسرے بھائی کی جان لینے کے دوہرے جرم 'اثم' کا وبال اپنے سر لینے اور جہنم رسید ہونے کی تہدید کی۔ حق و ناحق اور ظلم و انصاف کے تصورات سے بھی پہلے دور کا انسان آشنا تھا۔ جیسا کہ ہابیل نے سب سے

آخر میں اسی کا حوالہ دیا۔ اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ۝ (مائدہ: ۲۹) (میں چاہتا ہوں کہ میرے اور اپنے گناہ کا بوجھ تم ہی اٹھاؤ اور اس طرح دوزخیوں میں شامل ہو اور ظالموں کا بدلہ یہی ہے)۔

آگے اس واقعہ کی تفصیل سے ابتدائی دور کے تمدن کے دوسرے خط و خال بھی سامنے آتے ہیں:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ قَالَ یٰوَیْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ۝ (مائدہ: ۳۱)

تو اللہ نے ایک کوا بھیجا جو (اپنے مارے ہوئے دوسرے کوے کو گاڑنے کے لیے) زمین کھود رہا تھا تاکہ وہ قابیل کو دکھائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح چھپائے۔ اس پر قابیل بول پڑا ہائے میری تباہی۔ میں یہ بھی نہ کر سکا کہ اس کوے ہی کے مانند ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا سکتا۔ اس طرح وہ شرمندہ ہونے والوں میں ہوا۔

ہوا یوں کہ ہابیل کو قتل کر دینے کے بعد قابیل ایک دوسری مصیبت میں گرفتار ہو گیا تفسیری روایات برمحل ہیں کہ اس اقدام کے بعد قابیل کا جذبۂ اخوت امنڈا اور وہ اپنے بھائی کی لاش کو لیے ادھر ادھر پھرتا رہا[۴۰]۔ آغاز انسانیت میں کسی میت کے دفن کا یہ پہلا واقعہ تھا جس کے لیے خدائی رہنمائی درکار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام ایک کوے کو بھیج کر کیا جس نے قابیل کے سامنے دوسرے مرے ہوئے کوے[۴۱] کو زمین کھود کر اس میں دفن کر دیا۔ اس طرح قابیل کی سمجھ میں بات آگئی اور اسے اپنے بھائی کو دفن کرنے کا طریقہ معلوم ہو گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے دور کا انسان تمدن کے دوسرے طور طریقوں کے ساتھ دفن میت کے طریقے سے واقف تھا اور یہ طریقہ مردے کو جلانے کے ظالمانہ اور خلاف فطرت ساتھ ہی معاشی اور ماحولیاتی لحاظ سے بوجوہ نقصان دہ طریقے کے بجائے اسے گاڑنے اور سپرد خاک کرنے کا تھا۔ روئے زمین پر پہلا مرنے والا انسان بے گور و کفن نہیں پڑا رہا۔ خدائی شریعت جو آغاز انسانیت سے ترقی پذیر ہے، تمدن کے جس مرحلہ میں اسے اس ضرورت کا سامنا ہوا اس نے

بلا تاخیر اس کا حل تجویز فرما دیا۔ سیدنا آدمؑ کے سلسلے میں روایات میں یہ صراحت موجود ہی ہے کہ اولاد آدمؑ کے روبرو ان کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتوں نے انھیں غسل دیا، کفن پہنایا، انھیں خوشبو لگائی، ان کی نماز جنازہ پڑھی اور قبر کھود کر انھیں اس میں دفن کیا۔ بعد ازاں اولاد آدمؑ کو خطاب کر کے انھیں تاکید بھی کی کہ آئندہ تمام مُردوں کے سلسلے میں تمہارا یہی طریقہ اور یہی راستہ ہے۔[۴۲]

حضرت آدمؑ کے ان دو سگے بیٹوں کے قصے سے آغاز تمدن سے انسان کے لوہے کی صنعت کی واقفیت اور اس کے استعمال کا بھی اشارہ نکلتا ہے۔ فقہ کی رو سے قابیل نے ہابیل کو جس انداز سے قتل کیا اس میں وہ 'قتل عمد' کا مرتکب ہوا۔ فقہ میں قتل کی اس صورت کا اطلاق خاص طور پر کسی ہتھیار یا دھار دار چیز کے استعمال پر ہی ہوتا ہے۔[۴۳] حضرت آدمؑ کی کھیتی باڑی اور ان کی لوہے کی صنعت سے واقفیت کی روایت پہلے ہی گزر چکی ہے۔ یوں بھی قرآن نے آغاز رسالت کے ساتھ کتاب اور تول کے پیمانہ 'میزان' کے پہلو بہ پہلو لوہے کا تذکرہ کیا ہے۔ جب حضرت آدمؑ پہلے انسان کے ساتھ پہلے رسول بھی ہیں تو ان کے اس صنعت سے نابلد ہونے کا کوئی موقع نہیں ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ	ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے
اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا	ترازو اتارا تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں
الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ	اور (ساتھ ہی) ہم نے لوہا اتارا جس کے
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ	اندر بڑی قوت ہے اور لوگوں کے فائدہ
(حدید : ۲۵)[۴۴]	کے لیے طرح طرح کا سامان ہے۔

یہ بات دلچسپی کی ہے کہ اولاد آدم کے لیے لباس کی سابقہ قرآنی تعلیم کی طرح اس موقع پر اسرائیلی شریعت کے ساتھ آخری شریعت میں بھی[۴۵] انسانی جان کے قتل کی حرمت کا بیان ہابیل و قابیل کے اسی واقعہ کے حوالہ سے ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کے ختم کے فوراً بعد فرمایا:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى	اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر فرض قرار
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ	دیا کہ جو کوئی کسی جان کو قتل کرتا ہے کسی
نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى	جان کے بدلہ کے بغیر اور بغیر اس کے کہ

فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعاً ؕ	وہ زمین میں کسی فساد پھیلانے کا بدلہ ہو تو
وَمَنْ اَحْیَاھَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ	گویا اس نے (دنیا کے) تمام انسانوں کو
جَمِیْعًا ؕ...	قتل کر دیا اور جو کوئی ایک جان کی زندگی
(مائدہ: ۳۲)	کا سامان کرتا ہے اس نے گویا (دنیا کے)
	تمام انسانوں کی زندگی کا سامان کیا۔

آگے اسی حوالہ اور اسی تسلسل میں اسلام میں سرقہ کبریٰ، ڈکیتی اور رہزنی کی تفصیل ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے
وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ	جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد
فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا	پھیلاتے پھرتے ہیں ان کا بدلہ تو بس
اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ	یہی ہے کہ انھیں بری طرح قتل کیا جائے،
مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ	یا انھیں پھانسی دے دی جائے یا ان کے
ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ	ایک ہاتھ اور دوسرے پیر کاٹ دیے
فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝	جائیں یا انھیں زمین سے نکال دیا جائے
(مائدہ: ۳۳)	یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت
	میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

دنیا کا پہلا مکان:

قرآن میں خانہ کعبہ، بیت اللہ الحرام کی دوسری جو بہت سی خصوصیات اور اس کے امتیازات بیان کیے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آغاز انسانیت میں وہ روئے زمین پر تعمیر ہونے والا سب سے پہلا مکان ہے۔ دنیا میں پہلے انسان نے قدم رکھا تو اس کی طاعت و بندگی کی ضرورت کے لیے یہ خانۂ خدا اس کے لیے پہلے سے موجود تھا۔ یا یہ کہ پہلے انسان کے ہاتھوں اس کی تعمیر عمل میں آگئی اور وقت کے وقت اس کی یہ ضرورت پوری کر دی گئی:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	پہلا گھر جس کی (دنیا میں) لوگوں کے لیے تعمیر

لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی	عمل میں آئی وہ وہی (خانہ کعبہ) ہے جو مکہ
لِّلْعٰلَمِیْنَ ۚ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ	میں ہے۔ سراپا خیر و برکت اور تمام دنیا والوں
بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ ۚ	کے لیے ہدایت کا ذریعہ۔ اس کے اندر کھلی ہوئی
....	نشانیاں ہیں، ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے
(آل عمران: ۹۶، ۹۷)	کی جگہ....

خانہ خدا کے سلسلے میں دونوں ہی طرح کی رائیں ہیں کہ حضرت آدمؑ سے بھی پہلے فرشتوں کے ہاتھوں اس کی تعمیر ہو چکی تھی۔ دوسری رائے کے مطابق پہلے پہل اس کی تعمیر حضرت آدمؑ کے ہاتھوں ہوئی[۴۶]۔ مفسر سدی کا خیال ہے کہ علی الاطلاق روئے زمین پر یہ پہلا مکان ہے جو معرض وجود میں آیا[۴۷]۔ بعض دوسری روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس کی تعمیر حضرت آدمؑ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کی تعمیر کے ساتھ ہی آں جناب کو اس کے طواف کا حکم ہوا[۴۸]۔ دوسرے موقع پر خانۂ خدا کو دنیا کا سب سے قدیم مکان کہا گیا ہے:

..... وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ	..... اور چاہیے کہ لوگ
الْعَتِیْقِ ۝ (حج: ۲۹)	قدیمی گھر کا طواف کریں۔

'البیت العتیق' قدیم مکان کی سب سے مشہور تفسیر یہی ہے کہ یہ سب سے پہلا مکان ہے۔ جو روئے زمین پر انسانوں کے لیے تعمیر ہوا[۴۹]۔ 'عتیق' کے دوسرے معنی 'بچائے ہوئے' کے ہیں۔ اس معنی کے مطابق اس گھر 'بچایا ہوا گھر' (البیت العتیق) اس لیے کہا گیا کہ یہ طوفان نوح کے زمانہ میں ڈوبنے اور تباہ و برباد ہونے سے محفوظ رہا[۵۰]۔ جب کہ دوسری روایت کے مطابق اس موقع پر اسے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا[۵۱]۔ اس گھر کی سیدنا ابراہیمؑ کے ہاتھوں تعمیر نو کی تفصیل میں قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے:

۱۔ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ	اور وہ کیا وقت تھا جب ہم نے ابراہیم کو اس
(حج: ۲۶)	گھر کی جگہ کا پتہ بتایا۔
۲۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ	اور وہ کیا وقت تھا جبکہ ابراہیم اس گھر کی
الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ	بنیادوں کو بلند کر رہے اور اسماعیلؑ اس کام
(بقرہ: ۱۲۷)	میں ان کے شریک کار تھے)۔

ان آیات کریمہ کے الفاظ سے بھی حضرت ابراہیمؑ سے پہلے سے اس گھر کی موجودگی پر استدلال کیا گیا ہے۔ 'بوأنا' کے معنی کسی مقام اور کسی جگہ کی نشاندہی کرنے اور اس کا پتہ بتانے کے ہیں[۵۵۲]۔ اس سے خود بخود واضح ہے کہ اس موقع پر عمارت کا نشان پہلے سے موجود تھا۔ دوسری آیت کریمہ میں 'قواعد' قاعدہ کی جمع ہے جس کے معنی ستون اور بنیاد 'الساریہ والاساس' کے ہیں[۵۵۳]۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ ستون و بنیاد کے نشانات موجود تھے۔ سیدنا ابراہیمؑ نے اسے بالکل از سر نو نہیں تعمیر کیا بلکہ موجود ستونوں اور بنیادوں کے بلند کرنے کا کام آپ کے ہاتھوں انجام پایا۔ ہابیل و قابیل کے قصہ میں حضرت آدمؑ کے حج کو جانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ انھیں طواف کا حکم دیئے جانے کی دوسری روایت بھی گزر چکی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اپنی شجرۂ ممنوعہ کھانے کی غلطی کے اعتراف کے بعد بارگاہِ رب العزت سے جن کلمات کا التقاء کیا گیا:

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ — تو آدم کو اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات

(البقرہ: ۳۷) — القاء ہوئے۔

اس کی ایک تفسیر حج سے بھی کی گئی ہے۔ نخعی کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عباس کی تفسیر کے مطابق ان کلمات سے مراد آدمؑ و حواؑ کو حج کے طریقے اور کلمات کی تلقین ہے۔ اس روایت کے مطابق ان دونوں نے اس فریضہ کو ادا کیا جس کے بعد ان کی توبہ قبول کر لی گئی[۵۵۴]۔ ان تمام روایات اور قرآنی اشارات کا اقتضاء بیت اللہ کی قدامت اور سیدنا آدمؑ کے وقت سے روئے زمین پر اس کی موجودگی ہے۔

قرآن کے بعض دیگر اشارات سے بھی سیدنا آدمؑ کے وقت سے بیت اللہ کی موجودگی کی تائید ہوتی ہے۔ نماز کے بغیر دین اور خدائی شریعت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نماز کے لیے قبلہ ضروری ہے۔ فرعون کے ظلم و جبر میں جب قوم بنی اسرائیل کے لیے اپنی عبادت گاہوں میں نماز پڑھنا ممکن نہ رہا تو انھیں اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنانے اور اپنے موجود گھروں کے ایک حصہ میں قبلہ رو ہو کر بندگی رب کے اس اولین نشان کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا[۵۵۵]۔ سورۂ انبیاء میں کسی استثناء کے بغیر تمام رسولوں کی دعوت ایک خدا کی بندگی کو قرار دیا گیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ — اور تم سے پہلے ہم نے جو رسول بھی بھیجے سب کو

اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا	اسی کی وحی کی کہ میرے سوا کوئی دوسرا معبود
فَاعْبُدُوْنِ (آیت: ۲۵)	نہیں تو تم سب میری ہی بندگی کرو۔

آگے مختلف انبیاء علیہم کے تذکرہ کے بعد ان کے لیے اس حکم عبادت کی جو تشریح کی گئی ہے اس میں اور باتوں کے علاوہ نماز کی اقامت کا حکم شامل ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ	اور ہم نے ان کو سردار ٹھہرایا جو ہمارے حکم کے
بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ	مطابق (لوگوں کو) راہ بتاتے اور ہم نے
الْخَیْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءَ	ان کے پاس بھلائی کے کاموں اور نماز
الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ۙ	قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی۔ اور
(انبیاء: ۷۳)	(اس طرح) یہ لوگ ہماری بندگی کرتے
	والے تھے۔

نبوت آدم کی بحث گزر چکی۔ اس سے بھی واضح ہے کہ سیدنا آدمؑ اور ان کی ذریت کے لیے نماز کا حکم موجود تھا جس کی ضرورت اپنے آپ قبلہ کی ضرورت اور بیت اللہ کی اس وقت سے موجودگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے حق میں قرآن کی دوسری دلیل اس سے زیادہ صریح ہے۔ سورۂ مریم میں بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے علاوہ سیدنا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور حضرت نوحؑ سے پیشتر نبی حضرت ادریسؑ وغیرہ کے بعد ان انبیاء کے ساتھ اپنے ہدایت یافتہ اور منتخب کردہ بندوں کو شامل کرتے ہوئے ان کی مشترک خصوصیت بیان کی گئی:

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ	نبیوں کی یہ جماعت ہے جس پر خدا کا خاص
مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّةِ اٰدَمَ وَ	انعام ہوا آدمؑ کی نسل سے اور ان لوگوں
مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ وَّمِنْ	میں سے جنھیں ہم نے نوحؑ کے ساتھ پار
ذُرِّیَّةِ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْرَآءِیْلَ	لگایا اور ابراہیمؑ اور اسرائیلؑ کی نسل سے
وَمِمَّنْ هَدَیْنَا وَاجْتَبَیْنَا ؕ اِذَا	اور ان لوگوں میں سے جنھیں ہم نے راہ یاب
تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا	کیا اور چیدہ قرار دیا۔ ان کا حال ہے کہ جب
سُجَّدًا وَّبُكِیًّا ۝	ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں

(مریم: ۵۸) تو یہ سجدوں میں گر پڑتے ہیں ساتھ ہی ان کی ہچکیاں بندھی ہوتی ہیں۔

آگے اس سے متصل ان کے ناخلف وارثین کا تذکرہ ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ — تو ان کے بعد کچھ ناخلف آئے جنھوں نے
اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا — نماز گنوا دی اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے
الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (مریم: ۵۹) — تو جلد یہ اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

آیت کریمہ میں 'خروا سجدا وبکیا' (وہ سجدوں میں گر پڑتے اور زار و قطار روتے ہوتے ہیں) نماز کی تعبیر ہے جسے اگلی آیت میں ناخلف جانشینوں کی تساہلی کی تفصیل میں 'نماز کھو دینے' (اضاعوا الصلوٰۃ) سے کھول دیا گیا ہے۔ ان آیتوں میں نماز کی یہ خصوصیت جن انعام یافتہ انبیاء کی قرار دی گئی ہے ان کے ذریت آدمؑ سے ہونے کی صراحت ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ سیدنا آدمؑ کا اس حکم سے استثنا ہو اس کی مزید تقویت 'ھدینا اور واجتبینا' کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ جو جیسا کہ گزرا دوسرے موقع پر سیدنا آدمؑ کے لیے استعمال ہوا ہے:

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ — پھر اس کے رب نے اس کو منتخب قرار دیا۔
وَهَدٰى — تو اس نے اس کی توبہ قبول کی اور (اسے)
(طٰہٰ: ۱۲۲) — راہ یاب کیا۔

نبوت آدم میں اگر بحث بھی ہو تو ان کے 'ہدایت یافتہ اور منتخب کردہ' ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہے۔ قرآن کی اس پر صراحت ہے۔ سورۂ مریم میں جب 'ہدایت یافتہ اور منتخب کردہ' بندوں کی خصوصیت نماز قرار دی گئی ہے جس کی بعد کی آیت میں صراحت ہے تو اس لفظ کا مصداق ہونے کے نتیجے میں سیدنا آدم کے لیے یہ خصوصیت اپنے آپ ثابت ہو گئی۔ گزر چکا کہ نماز کے لیے قبلہ شرط ہے۔ پس کعبۃ اللہ کا سیدنا آدمؑ کے وقت سے روئے زمین پر موجود ہونا ضروری ہے۔

قرآن سے اس کے حق میں ایک دوسری دلیل بھی ہے۔ مکہ جہاں خدا کا یہ گھر واقع ہے قرآن میں اسے ایک موقع پر تمام عالم کی بستیوں کا مرجع قرار دیا گیا ہے:

.....لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ ..... (اے نبیؐ) تاکہ تم ڈراؤ تمام بستیوں

حَوۡلَهَا ؕ کی اصل (مکہ) کو اور ان لوگوں کو جو اس کے گرد رہنے والے ہیں۔ (انعام: ۹۲)[۵۶]

اس آیت میں 'مکہ' کو تمام بستیوں کی ماں 'ام القریٰ' کہا گیا ہے۔ عربی میں ماں کے لیے 'ام' کا لفظ أُمَّ یُؤمُّ سے نکلا ہے جس کے معنی قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں۔ ماں کو 'ام' اسی لیے کہا گیا ہے کہ بچہ اس کی طرف قصد اور ارادہ کرتا ہے[۵۷]۔ اس طرح مکہ کو تمام بستیوں کی ماں کہنے کا مطلب ہے کہ دنیا کی آبادی کا وہ نقطۂ آغاز ہے۔ ابتدائے انسانیت سے آباد دنیا سے اس کو وہی نسبت حاصل ہے جو اپنے بچے کی نسبت سے ماں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ایک توجیہ تو یہ کی گئی ہے کہ روئے زمین پر یہ پہلی بستی ہے جو آباد ہوئی، دوسری توجیہ میں مکہ کو تمام بستیوں کی ماں اس لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کے پہلے مکان کی حیثیت سے خدا کے گھر کعبہ کی اس میں تعمیر کی[۵۸]۔

بیت اللہ کی اس قدیمی حیثیت سے بھی ابتدائے تاریخ کے مروجہ تصور کی تردید ہوتی ہے کہ آغاز تمدن میں انسان عرصۂ دراز تک مکان اور اس سے متعلقہ سہولیات سے یکسر ناآشنا اور نابلد اور ناواقف محض تھا۔

کشتیٔ نوحؑ:

ابتدائے تاریخ کے قرآنی تصور کے مطالعہ میں ایک دلچسپی کی چیز کشتیٔ نوحؑ بھی ہے۔ بائیبل کی روایت کے مطابق حضرت نوحؑ کا زمانہ ۲۹۴۸ پیشتر مسیحؑ اور پیدائش آدم ۴۰۰۴ پیشتر مسیحؑ کے ۱۰۵۶ سال بعد ہے۔ ہندسوں میں اس مدت کے قرآن کے غیر متعلقہ موضوع سے قطع نظر حضرت آدمؑ کا پہلا انسان اور حضرت نوحؑ کا ان کے قریب ترین زمانہ میں ہونا مسلم ہے۔ حضرت آدمؑ کے ایک ہزار سال کی عمر پانے کی روایت بھی گزر چکی ہے۔ حدیث اور بائیبل کے ان دونوں بیانوں کے مطابق حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کا زمانہ ایک دوسرے سے بالکل متصل اور قریب ہے۔ حضرت نوحؑ کی زندگی کا سب سے مستند ریکارڈ قرآن میں ہے اور ان کے حالات و واقعات کو اس میں کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اپنی قوم کے درمیان ان کے کار نبوت کی مدت قرآن کی صراحت کے مطابق ساڑھے نوسو سال ہے[۵۹]۔ اس طویل مدت تک جب ان کی قوم ان کی دعوت کے انکار پر اصرار کیا تو خدا تعالیٰ

کی طرف سے اس قوم کو پانی کے عذاب سے ہلاک کرنے کا فیصلہ ہوا۔ طوفانِ نوحؑ تاریخ کا مسلمہ ہے۔ قرآن میں اس طوفان کی شدت کی تفصیل میں کہا گیا ہے کہ زمین نے اپنا منہ پھیلا دیا اور آسمان نے اپنے دہانے کھول دیئے۔ اس کے نتیجے میں پانی کی جو موجیں اٹھیں وہ پہاڑوں کے مانند تھیں[۶۰]۔ عہد نامۂ قدیم میں اس طوفان کی شدت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ "بڑے سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات زمین پر پانی کی جھڑی لگی رہی۔ اور پانی زمین پر بے نہایت بڑھ گیا اور سب اونچے پہاڑ جو آسمان کے نیچے ہیں چھپ گئے۔ پندرہ ہاتھ پانی ان کے اوپر بڑھا اور پہاڑ ڈوب گئے اور پانی کی باڑھ ڈیڑھ سو دن تک زمین پر رہی"[۶۱]۔ قرآن کے بیان کے مطابق اس طوفان سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر حضرت نوحؑ نے خدا تعالیٰ کی نگرانی اور ان کی وحی و رہنمائی کے مطابق کشتی تیار کی[۶۲]۔ دوسرے موقع پر قرآن کی صراحت کے مطابق اس کشتی کے تیار کرنے میں 'تختوں اور کیلوں' (الواح و دسر) کا استعمال ہوا تھا[۶۳]۔ اور اس کی گنجائش اتنی تھی کہ حضرت نوحؑ کے ساتھ ان کے اہل ایمان خاندان اور اہل ایمان جماعت[۶۴] روئے زمین کے دوسرے تمام جانداروں کے دو دو جوڑے اس میں سما گئے[۶۵]۔ کتاب پیدائش کی رو سے ہر جنس کے نر و مادہ چرندوں، پرندوں اور رینگنے والے جانوروں کے ساتھ ان کی خوراک کا سامان بھی اس کشتی میں رکھنے کا حکم ہوا تھا[۶۶]۔ جب کہ اسی کتاب میں کشتی کی نوح کی تفصیل اس طرح کی گئی ہے:

"تو اپنے سامنے گوپھر کی لکڑی کی ایک کشتی بنا۔ اس کشتی میں کوٹھریاں تیار کرا اور اس کے باہر اور بھیتر رال لگا اور اس کو ایسی بنا کہ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ اور اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ کی ہو۔ اور اس کشتی میں روشن دان بنا اور اوپر سے ایک ہاتھ بھر میں اسے تمام کر۔ اور کشتی کی ایک طرف دروازہ بنا۔ اور نیچے کا طبقہ اور دوسرا اور تیسرا بھی بنا"[۶۷]۔

دنیا کے لٹریچر میں ماقبل تاریخ کے زمانہ سے متعلق معلومات کے مستند مرجع قرآن کے علاوہ دوسرا ذریعہ کتاب مقدس عہد نامۂ قدیم و جدید ہی ہے۔ اپنے ماننے والوں کی طرف سے بھی ان کتابوں میں تحریفات کے اعتراف کے باوجود کتاب مقدس کے اس طرح کے بیانات صد فیصد درست نہ بھی ہوں جب بھی ان سے اس وقت کی صورت حال کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب مقدس سے اس درجہ کے استفادہ کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔

آغاز تمدن کے اولین عرصہ میں بحکم خدا جب حضرت نوحؑ نے اس طرح کی زبردست کشتی تیار کردی تو ابتدائے تاریخ کے مروجہ اس تصور میں کیا وزن رہا کہ پہلے دور کا انسان انسان نما جانور اور آثار تمدن و تہذیب سے بالکل ناآشنا تھا۔

جنتری کا استعمال:

قرآن کی تصریح سے ابتدائے آفرینش سے سال کے بارہ مہینوں کی تعیین اور اس طرح جنتری کی بنیاد کا ثبوت ملتا ہے۔ سورۂ توبہ میں قرآن کا بیان ہے:

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ	مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہے
اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ	اللہ کی کتاب میں جس دن سے کہ اس نے
يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ان میں سے
مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ.... (توبہ: ۳۶)	چار (مہینے) خاص ادب کے ہیں۔

کتاب اللہ سے یہاں مراد لوح محفوظ ہے[۶۷]۔ اور یہ چار محترم مہینے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے ہیں[۶۸]۔ جیسا کہ آگے حدیث میں بھی اس کی صراحت ہے۔ پچھلی شریعتوں کی طرح شریعت ابراہیمیؑ میں بھی ان مہینوں کی حرمت مسلم تھی۔ چنانچہ ان مہینوں میں لوٹ مار لڑنے جھگڑنے یہاں تک کہ برائی کے عام کاموں سے بچنے کا بھی مشرکین عرب کے یہاں دستور تھا[۶۹]۔ مشرکین عرب نے دین انسانیت کے براہیمی تسلسل میں جو بہت سی گڑبڑیاں کیں اور بدعتوں کا سلسلہ گھڑا، ان میں سے ایک ان چاروں محترم مہینوں میں ہیرا پھیری اور ایک کو دوسرے کی جگہ پر کرنا اور ہٹانا تھا جس کے لیے قرآن نے 'نسیٔ' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ سورۂ توبہ کی آگے کی آیت کریمہ میں اس کی تفصیل ہے:

اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ	مہینوں کی ہیرا پھیری بس کفر میں آگے بڑھنا
يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ	ہے جس سے وہ لوگ جنھوں نے کفر کا راستہ
عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا	اختیار کیا ان کی گمراہی کا سامان ہوتا ہے۔
عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا	وہ ایک مہینہ کو ایک سال حلال قرار دیتے
حَرَّمَ اللّٰهُ	ہیں اور دوسرے سال اسے حرام کر دیتے

(التوبہ : ۳۷) ہیں۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ گنتی میں اس کی موافقت کرلیں جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ اس طرح اللہ نے جس چیز کو حرام ٹھہرایا ہے اسے یہ لوگ حلال کر لیتے ہیں۔

'نسیٔ'' نساء' سے ہے جس کے معنی موخر کرنے اور ٹالنے کے ہیں۔ 'نسیٔ' کی یہ رسم بد جسے آیت بالا میں کفر میں زیادتی سے تعبیر کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین عرب اپنی لڑائی اور جنگ کی ضرورت سے مذکورہ محترم مہینوں کو مستقل طور پر آگے پیچھے کرتے رہتے تھے۔ وہ لڑائی اور جنگ میں ہوتے، اسی دوران محرم کا مہینہ آجاتا تو جنگ کو فوراً ختم کر دینے کے بجائے اس محترم مہینے کو صفر پر ٹال دیتے اور لڑائی بدستور جاری رکھتے۔ دوسرے محترم مہینوں کے سلسلے میں بھی ان کی یہی حرکت اور وطیرہ تھا جس سے آیت شریفہ میں ان سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔ اس طرح یہ لوگ سال کے چار حرام مہینوں کی گنتی تو پوری کر لیتے تھے لیکن ان کی تعیین میں حسب خواہش ردوبدل کرتے رہتے تھے۔ مہینوں کے الٹ پھیر کا یہ سلسلہ جاری تھا تاآنکہ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری بار حج کا موقع آیا۔ یہ عجیب قران (COINCIDENCE) تھا کہ جس سال آپؐ کا آخری حج تھا گردش ماہ وسال اپنے صحیح وقت پر آکر حج ٹھیک قاعدہ کے مطابق ذوالحجہ کے مہینے میں اپنی ٹھیک تاریخوں میں پڑا۔ چنانچہ اس حج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا اس میں اس حسن قران کا حوالہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

الا ان الزمان قد استدار	سن لو، زمانہ گھوم کر اس ڈھرے پر آگیا ہے
کھیئتہ یوم خلق السمٰوٰت	جیسا کہ وہ اس دن تھا جبکہ اللہ نے آسمانوں
والارض السنۃ اثنا عشر شہرا	اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ یہ کل بارہ مہینے ہیں
منہا اربعۃ حرم ثلاثۃ متوالیات	جن میں چار خاص ادب کے ہیں۔ تین تو
ذوالقعدہ و ذوالحجہ والمحرم	مسلسل ہیں ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم
ورجب مضر الذی بین جمادی	چوتھا رجب مضر ہے جو کہ جمادی الاخری

وشعبان۔ [۲۴] اور شعبان کے درمیان ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کی طرح بخاری ومسلم وغیرہ کی اس روایت میں بھی سال کے بارہ مہینوں کی تعیین کے ساتھ آسمان وزمین کی پیدائش کے دن سے ان کے وجود میں آنے کی صراحت ہے۔ قرآن میں سورج اور چاند کی پیدائش کو ان کے دیگر فوائد کے علاوہ شمسی وقمری تاریخوں اور گنتی کے استعمال کا جو ذریعہ بتایا گیا ہے۔[۴۳] اس کا بھی صاف تقاضا ہے کہ انسان نے روئے زمین پر جب بھی قدم رکھا ہو اور زمین انسانی آبادی سے تاریخ کے جس دور میں بھی روشناس ہوئی ہو، حساب کتاب اور تاریخ اور جنتری اور کلنڈر کا استعمال اسی وقت سے ہے۔ کہاں انسانیت کی ذہنی اور علمی ترقی کا یہ قرآنی تصور اور کہاں ابتدائے تاریخ کا مروجہ فلسفہ کہ آغاز تمدن میں انسان ایک طویل عرصے تک وحشت وجہالت کے اندھیرے میں ڈوبا رہا۔

دین فطرت کا مقتضا :

قرآن میں ابتداء سے دین انسانیت ـ اسلام ـ کو دین فطرت کہا گیا ہے۔ جو شرعی یعنی ارتقاء کے تمام مراحل سے گزر کر آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں نقطۂ کمال کو پہنچا ہے۔ آج اسلام کی صورت میں دنیا کو جو عظیم روحانی نعمت ملی ہوئی ہے وہ اسی دین فطرت کا دوسرا نام ہے :

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ

یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی فطرت ہے جس پر اس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی سیدھا دین ہے۔ (روم: ۳۰)

حدیث میں اس دین فطرت کے پانچ تقاضوں کا خاص طور پر تذکرہ ہے جس میں داڑھی بڑھانے اور بغل کے بال نوچنے کے علاوہ بقیہ تینوں کا تعلق لوہے کے استعمال سے ہے۔ ناخن کاٹنا، مونچھوں کو مونڈنا اور زیر ناف کے بالوں کا صاف کرنا۔[۴۴] دوسری روایت میں مونچھ کے سلسلے میں صراحت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو اس کو مونڈتے ہی تھے سیدنا ابراہیمؑ بھی اس کا اہتمام کرتے تھے۔[۴۵] اس موقع پر سیدنا ابراہیمؑ کا تذکرہ خاص طور پر شاید اس لیے کیا گیا کہ مخاطب قوم کے نزدیک ان کی محترم

شخصیت مسلم تھی۔ دین فطرت کے اس تقاضے اور اس کے دیگر تقاضوں کی ادائگی سے دیگر انبیاء علیہم السلام کو مستثنیٰ کیے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ ابتدائے تاریخ کے مروجہ تصور کے برعکس نبوت کے ساتھ آغاز پانے والے تمدن کا اوّلین انسان لوہے کی صنعت سے واقف ہو جس سے وہ ابتدائے آفرینش سے دین فطرت کے مذکورہ تقاضوں کو پورا کر سکے۔

قرآنی فلسفہ دین کا عمومی مطالبہ:

آخر میں قرآنی فلسفہ دین کے عمومی مطالبہ سے بھی ابتدائے تاریخ کے مروجہ مذکورہ تصور کی تردید ہوتی ہے۔ قرآن میں یہ حقیقت مختلف مقامات پر اور مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے کہ پہلے انسان اور پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری پیغمبر حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تک خدائی دین کا ایک ہی تسلسل ہے جس کی بنیادی دفعات شروع سے آخر تک بالکل یکساں اور یک رنگ ہیں۔ توحید، آخرت، سلسلۂ رسالت پر ایمان، بنیادی عبادات، حلال و حرام کی موٹی موٹی تفصیلات انبیائی دین کی یہ وہ متفقہ دفعات ہیں جن میں کسی پیغمبر کا استثنا اور اختلاف نہیں ہے۔ سورۂ شوریٰ اور سورۂ انبیاء اور مومنون کی آیات کریمہ:

۱۔ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (شوریٰ: ۱۳)	یہ کہ تم اصل دین کو برقرار رکھو اور اس میں اختلافات کا شکار نہ ہو۔
۲۔ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء: ۹۲)	یہ کہ یہ تمہاری ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو تم سب میری ہی بندگی کرو۔
۳۔ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (مومنون: ۵۲)	یہ کہ تمہاری ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔

میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہی وجہ ہے جو پورے سلسلۂ رسالت پر ایمان لانے کو قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے بطور شرط کے پیش کیا گیا ہے۔ انبیائی شریعت کی متفق علیہ دفعات کا کسی قدر اندازہ سورۂ اعراف کی آیات ذیل سے ہوتا ہے۔ جو

قصہ آدمؑ کے متصل بعد اسی انداز سے رکھی گئی ہیں کہ یہ گویا ابتدائے انسانیت سے خدائی دین کا اٹوٹ حصہ اور انبیائی شریعت کے مسلمات ہیں:

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝ فَرِیْقًا هَدٰى وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

(اعراف: ۲۹-۳۰)

کہو کہ اللہ نے مجھ کو انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ تم اپنے رخوں کو سیدھا کرلو ہر نماز کے وقت۔ اور اللہ کو پکارو اس کے لیے اطاعت کو بے آمیز کرتے ہوئے جیسا کہ اس نے تم کو شروع میں پیدا کیا ہے ویسا ہی تم پلٹو گے۔ ایک گروہ کو اس نے راہ یاب کیا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جس پر گمراہی کا اٹل فیصلہ ہے۔ انھوں نے شیطانوں کو اپنا دوست بنالیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ راہ یافتہ ہیں۔

آگے لباس کے حکم کی آیات کے بعد جن کا تذکرہ پہلے گزرا! اسی طرح کی جامع دوسری تعلیمات کا تذکرہ کیا گیا:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ۝

کہو کہ میرے رب نے بے حیائی کی تمام باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی ایسا ہی اس نے گناہ اور ناحق سرکشی کو ٹھہرایا ہے اور اس کو کہ تم اللہ کے ساتھ اس چیز کو ساجھی ٹھہراؤ جس کے حق میں اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم اللہ پر وہ الزام باندھو جسے تم جانتے نہیں اور ہر انسانی جماعت کے لیے ایک مدت ہے تو جب ان کی اس مدت کا وقت آجائے گا تو نہ وہ ایک لحظہ پیچھے ہٹ

سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ (اعراف: ۳۴:۳۴)

ان آیات کریمہ کا صریحی مطالبہ ہے کہ انسانیت پر ایک لمحہ کے لیے بھی ایسا دور نہیں گزرا جبکہ وہ توحید کے پیغام حق والصاف کی تعلیم اور دین انسانیت کی دیگر متفقہ دفعات سے ناآشنا یکسر شرک و بت پرستی اور ظلم وجہالت کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہو۔ حالات کے اقتضاء اور ضرورت سے دین کی متفقہ کلیات سے ہٹ کر الٰہی شریعت کے ارتقار اور اس میں جزوی اور فروعی اختلاف تو مسلمہ ہے لیکن ابتدائے تاریخ کا یہ تصور کہ پہلے دور کا انسان زمانۂ دراز تک شرک وبت پرستی کے اندھیرے کے ساتھ آثار وعلامات تمدن سے بالکل ناآشنا رہا، قرآن کے لیے قابل قبول نہیں۔ زندگی کی سہولیات میں ترقی اور زمانہ کے ساتھ ان میں اضافہ اور تنوع تو تاریخ کی بدیہی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں لیکن قرآنی فلسفہ دین کے اس عمومی مطالبہ کا تقاضا ہے کہ ہر دور میں انسان تمدن کی بنیادی ضرورتوں سے آشنا ہونے کے ساتھ خدائی شریعت کی دولت سے ہر دور اور ہر زمانہ اور آغاز انسانیت اور پہلے انسان کے وقت سے بہرہ ور تھا۔ حضرت آدمؑ کی نبوت کا مسئلہ اگر قابل بحث بھی ہو تو اس حد تک دینی زندگی کے تقاضوں سے آشنائی ان کی بھی مسلم ہے جس سے وہ اپنی تمدنی ضرورت کے لحاظ سے خدائی دین کے مطالبات کو پورا اور ان پر عمل پیرا ہو سکیں۔

قرآن اور اسلام کو یہ امکان تو تسلیم ہے کہ تاریخ کے بعید ترین ادوار میں بعض طاقتور اور نسبتہً مہذب قوموں نے دوسری کمزور اور غیر مہذب قوموں کو تمدنی مراکز سے ہٹا کر اپنے مصالح سے انھیں دور بھگا دیا ہو اور لمبے وقفوں اور زمانوں تک انھیں جہالت و تاریکی اور تاریخی حیثیت سے انھیں پردۂ خفا میں چلے جانے کے لیے مجبور کر دیا ہو۔ جیسا کہ مثال کے طور پر ہندوستان میں قدیم زمانہ میں آریوں نے دراوڑوں اور یہاں کی دوسری قدیم آبادیوں کے ساتھ کیا۔ جنھیں انھوں نے شمال کی دوآبہ کی سرسبز وشاداب اور زرخیز سرزمین سے بھگا کر جنوب کے کنکریلی پتھریلی زمینوں اور جنگلات میں ڈھکیل دیا۔ دنیا کی دوسری اقوام کی نسبت سے بھی قرآن اس امکان کو تسلیم کرتا ہے لیکن ابتدائے تاریخ کا یہ تصور کہ پہلے دور کا انسان محض جاہل اور وحشی اور ایک عرصۂ دراز تک وہ اسی جہالت اور وحشت کے عالم میں رہا۔ بعد میں آہستہ آہستہ اپنے تجربے اور تحقیق سے اسے آثار وعلامات تمدن اور اس کے ساتھ جینے کے طریقے اور زندگی کے اعلیٰ فلسفہ سے واقفیت

ہوئی۔ قرآن کے لیے ابتدائے تاریخ کا یہ مزعومہ تصور بالکل ناقابلِ قبول ہے۔ اور جیسا کہ تفصیلات میں آپ نے دیکھا چند در چند دلائل سے وہ اس کی تردید کرتا اور اس کی غلطیوں کی وضاحت کرتا ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاَمِیْنِ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔

حواشی و حوالہ جات

1. Environmental Studies: We and our country, A text book for Class, N.C.E.R.T New Delhi, 1987, III, P. 26.

2. Leonard Cottrell: The Anvil of Civilization London, P. 19.

۳؎ کتاب مقدس (عہد نامۂ قدیم) کتاب پیدائش۔ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، لاہور، بار ہفتم ۱۹۰۸ء

۴؎ اس کے علاوہ انعام: ۹۸، اعراف: ۱۸۹ اور زمر: ۶ میں بھی دنیا کے تمام انسانوں کے ایک جان 'نفس واحدہ' سے پیدا کیے جانے کی صراحت ہے۔ ہر جگہ اس سے مراد یہی حضرت آدمؑ کی ذات ہے۔

۵؎ ترمذی جلد ۲۔ ابواب التفسیر، تفسیر سورۂ حجرات۔ و رواہ ایضا ابن خزیمہ و ابن حبان بحوالہ فتح الباری: ۶/۳۳۸ مطبوعہ خیریہ، مصر ۱۳۱۹ھ طبعہ اولیٰ۔ قال ابن حجر رجالہ ثقات، حوالہ سابق۔

۶؎ ترمذی جلد ۲۔ ابواب المناقب، باب ثقیف و بنی حنیفہ، قال الترمذی ہذا حدیث حسن۔ اس سلسلے کی دیگر روایات کے لیے ملاحظہ کیجیے: ہماری کتاب 'اسلام کا تصور مساوات' میں 'بنائے فضیلت تقویٰ' کی بحث صفحات ۷۹ تا ۸۴۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ بار اول ۱۹۸۵ء۔

۷؎ صحیح مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان، باب اثبات الشفاعۃ و اخراج الموحدین من النار، اصح المطابع، دہلی

۸؎ تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۳۔

۹؎ بقرہ: ۲۶

۱۰؎ ط: ۱۲۱۔ میں بھی عارضی بے ستری کے بعد آدمؑ و حواءؑ کی طرف سے جنت کے پتوں سے اس کی مضطربانہ تلافی کی صراحت ہے: فَاَکَلَا مِنْہَا فَبَدَتْ لَہُمَا سَوْاٰتُہُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفَانِ عَلَیْہِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ الآیۃ۔ تو آدم و حوا نے اس درخت سے کھا لیا جس سے انکے قابل پوشیدہ حصے ان کے سامنے کھل گئے

تو انھوں نے اپنے کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنا شروع کر دیا۔

۱۱ھ تفسیر الجلالین/ ۸ دار المعرفۃ، بیروت۔ طبع اول ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۱۲ھ ہمارے نزدیک پہلی رائے راجح ہے کہ خلافت عام ہے اور تمام ذریت آدم سے متعلق ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے ہمارا مضمون 'خلافت آدمؑ'، مطبوعہ ماہنامہ زندگی نو نئی دہلی دسمبر ۱۹۸۶ء مطابق ربیع الاول، ربیع الآخر ۱۴۰۷ھ۔

۱۳ھ دوسرے بہت سے مفسرین کی طرح صاحب جلالین نے بھی آیت کی اسی توجیہ کو اختیار کیا ہے تفسیر الجلالین/ ۸ محولہ بالا۔

۱۴ھ تفسیر الجلالین، حوالہ سابق۔ ۱۵ھ حوالہ مذکور/ ۹۔

۱۶ھ ملاحظہ ہو سعد الدین التفتازانی م ۷۹۲ھ: شرح العقائد النسفیۃ/ ۹۹ کتب خانہ رشیدیہ دہلی (بدون سنہ)

۱۷ھ النسفی حوالہ سابق

۱۸ھ بستان الفقیہ لابی اللیث السمرقندی علیٰ ہامش شرح عقائد نسفی' محولہ بالا

۱۹ھ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۷۹۔ مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء۔

۲۰ھ عبد الرؤف المناوی م ۱۰۲۹ھ: التیسیر بشرح الجامع الصغیر: ۱/ ۴۹۳۔ دار الطباعۃ العامرہ مصر ۱۲۸۶ھ۔

۲۱ھ بقرہ: ۳۷۔ ۲۲ھ حج: ۷۸، شوریٰ: ۱۳۔

۲۳ھ قلم: ۵۰۔ ۲۴ھ یوسف: ۶

۲۵ھ نیز ملاحظہ کیجئے: حج: ۷۵، ص: ۴۷۔

۲۶ھ دیگر نظائر کے لیے ملاحظہ کیجئے: طہٰ: ۱۲۳، ۱۲۴۔ اعراف: ۳۵، ۳۶۔

۲۷ھ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۸۳۔ مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء۔ حال کے مفسرین میں مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی دونوں نے سیدنا آدمؑ کے پہلے نبی ہونے کو صراحۃ لکھا ہے تفہیم القرآن: ۱/ ۶۸۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ تیرہواں ایڈیشن ۱۹۷۱ء۔ تدبر قرآن: ۴/ ۲۳۹۔ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء۔

۲۸ھ نیز: انبیاء: ۹۲ تا ۹۴۔ سورۂ مومنون میں رسولوں کے اس تذکرہ میں حضرت نوحؑ کا ذکر شامل ہے۔ جبکہ سورۂ انبیاء میں ان کے ساتھ حضرت ادریسؑ کا تذکرہ ہے، انبیائی تربیت میں جن کا تذکرہ، جیسا کہ

تفصیل گزری، حضرت نوح سے پہلے ہے۔ اس کا صاف اشارہ ہے کہ اس حکم قرآنی کا تعلق ابتدائے انسانیت اور تمدن کے بالکل اولین زمانہ سے ہے۔

۲۹ موضح القرآن/۱، ۵۔ تاج کمپنی، لاہور

۳۰ حوالہ سابق/۷۷۴ ۳۱ تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۰۶

۳۲ تفسیر ابن کثیر، حوالہ سابق۔ ۳۳ تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۱

۳۴ حوالہ سابق: ۲/۴۱، ۴۶ ۳۵ تفسیر ابن کثیر، حوالہ مذکور

۳۶ تفسیر الجلالین/۱۴۱۔ ۳۷ تفسیر الجلالین، حوالہ سابق

۳۸ حوالہ مذکور

۳۹ علی المتقی علاء الدین الہندی م ۹۷۵ھ: کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال: ۶/۶۷۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن، طبعہ ثانیہ ۱۳۷۷ھ۔

۴۰ تفسیر الجلالین/۱۴۱۔

۴۱ حوالہ سابق۔ اس موقع پر مولانا امین احسن اصلاحی نے کوے کے اس عمل کی جو توجیہ کی ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ تدبر قرآن: ۲/۲۷۱، ۲۷۲۔ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور۔ بار دوم ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۶ء۔ لفظ 'بعث' اس کا انکار کرتا ہے۔ قرآن میں ہر جگہ اس لفظ کا استعمال خدائی اہتمام کو ظاہر کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس موقع پر خاص طور پر کوے کو انسان کے طریقۂ دفن کی رہنمائی کے لیے بھیجا۔ عام حالات میں کوے کی اگر یہ عادت نہ بھی ہو کہ وہ دوسرے کوے کو زمین میں دفن کرتا ہے تو خدائی الہام کے ذریعہ اس موقع پر خاص طور پر اسے اس کی انجام دہی کے لیے بھیجا گیا۔

۴۲ کنز العمال: ۶/۶۸ محولہ بالا۔

۴۳ برہان الدین المرغینانی م ۵۹۳ھ: ہدایہ: ۴/۵۴۳۔ کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔ نیز کنز الدقائق/۴۴۷، ۴۴۸۔ کتب خانہ رشیدیہ دہلی (بدون سنہ)۔

۴۴ آگے کی آیت کریمہ (حدید: ۲۶) میں ان رسولوں کی جو تفصیل کی گئی ہے ان میں خاص طور پر سیدنا ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ حضرت نوحؑ کا نام لیا گیا ہے جبکہ معلوم ہے کہ ہندوؤں میں حضرت نوحؑ

کا زمانہ جتنے ہزار بھی قبل مسیح ہو۔ آغاز انسانیت کے اولین مرحلہ سے ان کا متعلق ہونا مسلم ہے۔

۴۵ھ قاعدہ ہے۔ قرآن میں سابقہ شریعتوں کا حوالہ جہاں کہیں کسی نکیر کے بغیر ہے وہ سب باتیں آخری شریعت میں شامل ہیں۔

۴۶ھ تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷۳۔ محولہ بالا۔ ۴۷ھ حوالہ سابق: ۱/۳۸۳

۴۸ھ حوالہ مذکور۔ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مرفوعاً نقل کی گئی ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر کا کہنا ہے کہ اس کا حضرت عبداللہ بن عمرو پر موقوف ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ حوالہ سابق۔

۴۹ھ تفسیر الجلالین/۴۳۷

۵۰ھ مفاتیح الغیب المشتہر بالتفسیر الکبیر للرازی م ۶۰۶ھ: ۶/۱۸۱۔ مطبعہ ازہریہ، مصر ۱۳۰۸ھ

۵۱ھ تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۱۸۔ ۵۲ھ تفسیر الجلالین/۴۳۶

۵۳ھ تفسیر ابن کثیر: ۱/۱۷۵۔ آیات کریمہ کی یہ مشہور تفسیریں ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان دونوں آیتوں کی یہی تفسیر اختیار کی ہے سیرۃ النبیؐ: ۵/۲۵۱، ۲۵۲۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ، طبع یازدہم ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء ۵۴ھ مفاتیح الغیب: ۱/۳۲۶۔

۵۵ھ یونس: ۸۷۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آیت کریمہ کا یہی ترجمہ کیا ہے اور اس کی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ ترجمہ شیخ الہند مع تفسیر عثمانی/۲۸۲۔ تاج کمپنی (دہلی)

۵۶ھ دوسرے موقع پر بھی سرزمین مکہ کا تذکرہ اسی خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے: وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا (قصص: ۵۹)۔ اور اللہ کا یہ قاعدہ نہیں کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے یہاں تک کہ وہ ان کی اصل (مکہ) میں ایک رسول بھیجے۔

۵۷ھ ابن منظور الافریقی: لسان العرب: ۲/۲۷، ۳۰۔ دار صادر بیروت ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء

۵۸ھ مفاتیح الغیب: ۴/۹۵۔

۵۹ھ عنکبوت: ۱۴، روایات کے مطابق یہ مدت صرف آں جناب کے کار نبوت کی ہے۔ ورنہ قوم کی ہلاکت کے بعد بھی وہ ساڑھے چار سو برس مزید کل چودہ سو برس زندہ رہے۔ موضح القرآن/۶۵۹ محولہ بالا۔

۶۰ھ ہود: ۴۲۔ ۶۱ھ عہد نامۂ قدیم۔ کتاب پیدائش باب: ۷ آیات: ۱۱، ۲۴

۶۲ھ ہود: ۳۷۔

۶۳ھ قمر: ۱۳۔ 'دُسُر' 'کتاب' کے وزن پر 'دِسار' کی جمع 'آہنی کیلیں'، ہوما تشد بہ الالواح من المسامیر' تفسیر الجلالین/۷۰۵۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے اس کا ترجمہ بھی 'کیلوں' ہی سے کیا ہے، موضح القرآن/۷۷۸۔ 'کیلیں' لکڑی کی بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن قرآن کے 'کتاب اور لوہے کے ساتھ اترنے کے تصور' کے مطابق (حدید: ۲۶) جس کا حوالہ پیچھے گزرا کشتی سازی میں حضرت نوحؑ کی طرف سے لوہے کے استعمال میں بھی کوئی استبعاد نہ ہونا چاہئیے۔ تختے یوں بھی اپنے چیرے جانے کے لیے اس سے بڑھ کر لوہے کی صنعت سے واقفیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ بات کہ تختے خرق عادت کے طور پر آسمان سے اتارے گئے، ظاہر کے خلاف ہے، جس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔

۶۴ھ ہود: ۴۰

۶۵ھ کتاب پیدائش۔ باب: ۶ آیت: ۱۹۔

۶۶ھ حوالہ سابق۔ آیات: ۱۴-۱۶۔

۶۷ھ تفسیر الجلالین/۲۴۵

۶۸ھ حوالہ سابق

۶۹ھ حوالہ مذکور

۷۰ھ تفسیر الجلالین/۲۴۶،۲۴۵

۷۱ھ تفسیر عثمانی/۲۴۹۔ محولہ بالا

۷۲ھ بحوالہ تفسیر ابن کثیر: ۳۵۳/۲۔ عرب میں مضر کا قبیلہ نہ صرف اس عزت کے مہینے میں اپنی تمام خون آشام سرگرمیوں کو موقوف کر دیتا تھا بلکہ اس مہینے کے ساتھ خاص عقیدت و احترام کا معاملہ کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے رجب کا یہ مہینہ 'رجب مضر' کے نام سے معروف ہو گیا۔

۷۳ھ انعام: ۹۶۔ یونس: ۵۔ رحمٰن: ۵۔

۷۴ھ متفق علیہ بحوالہ مشکوۃ المصابیح، جلد ۲۔ کتاب اللباس، باب الترجل، فصل اول۔ کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۷۵ھ ترمذی جلد ۲۔ ابواب الاستیذان والادب۔ باب ما جاء فی قص الشارب، کتب خانہ رشیدیہ دہلی